ثانیہ رزاق

کچھ اندھیرے سے اجالے ہوں گے......

الف بے جیم ڈاٹ کام

رات زندگی جیسی ہے، روشنی سے جنم لیتی...... روشنی کو جنم دیتی۔ جنم لینے سے جنم دینے تک کا اندھیرا ہی تو کہانی ہے۔

''اندھیرا'' ہی تو اصل کہانی ہے......

سیاہی کے سمندر میں ذی جان سی کہانیاں، مرداروں سی یادیں۔ روشنی کے لیے جدوجہد کرتے کردار۔ اندھیرا ہی جنگ اور اندھیرے سے ہی تو جنگ ہے۔

سیاہی کے سمندر میں، تہ در تہ جمی کائی سی برس رسیدہ، ضدی رواجوں کی رکاوٹیں، اونچے شملوں کی گھلتے نمک سی محاذ آرائیاں، بوسیدہ شعور کی بندشیں...... اندھیرا ہی تو رکاوٹ ہے۔

سیاہی کے سمندر میں آب کو ترستے، تڑپتے، مرتے کردار...... محرومیاں ہی تو کہانی ہیں۔ اندھیرا ہی تو محرومی ہے۔

سیاہی کے سمندر میں 'اشرف' ہونے کی کوششوں میں جتا، رزیل ہوتی مخلوق، رزیل ہی تو کہانی ہیں۔ اشرف ہی تو اندھیرا ہیں۔

☆☆☆

ابھی گالوں کو ہوا نم لگتی، بدن کو اون ناگوار۔ موسم کچھ ایسا معتدل تھا وہاں۔

اندھیرا ادبکا بیٹھا جگہ نہ چھوڑتا، اجالے کو تیزی پڑی تھی۔ وقت کچھ ایسا تھا وہاں۔

آکاس بیل...... بوگن ویلیا کے بوجھ تلے دبا وہ بنگلہ یوں اونگھتا کہ گود میں سوئے مکینوں کو لوریاں آنے لگتیں۔ پھول، ہوا، بادلوں، باغیچوں کے خواب......

''ڈیڈی......!'' مارچ جیسی آواز میں پکارتی، لوریاں گونج دار ہو جاتیں، خواب تیز تر۔

''میں دنیا کی واحد لڑکی ہوں گی جو بے خبر سوئے

الف بے جیم ڈاٹ کام

باپ کو جگا کے بولتی ہے کہ وہ کام پہ جانے والی ہے۔"
"میں بھی وہ واحد باپ ہوں گا جو بیٹی کے بجائے ہونے والے داماد کے رنگ ڈھنگ پر کڑھتا ہے۔"
غفران سندھیلا بے حد سنجیدگی سے شروع ہوئے۔
"تو آپ روک لیتے ناں مجھے۔" وہ کھڑکی سے سامنے والے بنگلے کا اندھیرا ماپتی، سانسیں بھرتی، بمشکل مسکرائی۔
"ہونہہ! میں تو تمہیں انویسٹی گیشن رپورٹر بننے سے نہ روک سکا۔"
ہر بار کا گلہ...... اندھیرا چیخ گیا۔

ناولٹ

الف بے جیم ڈاٹ کام

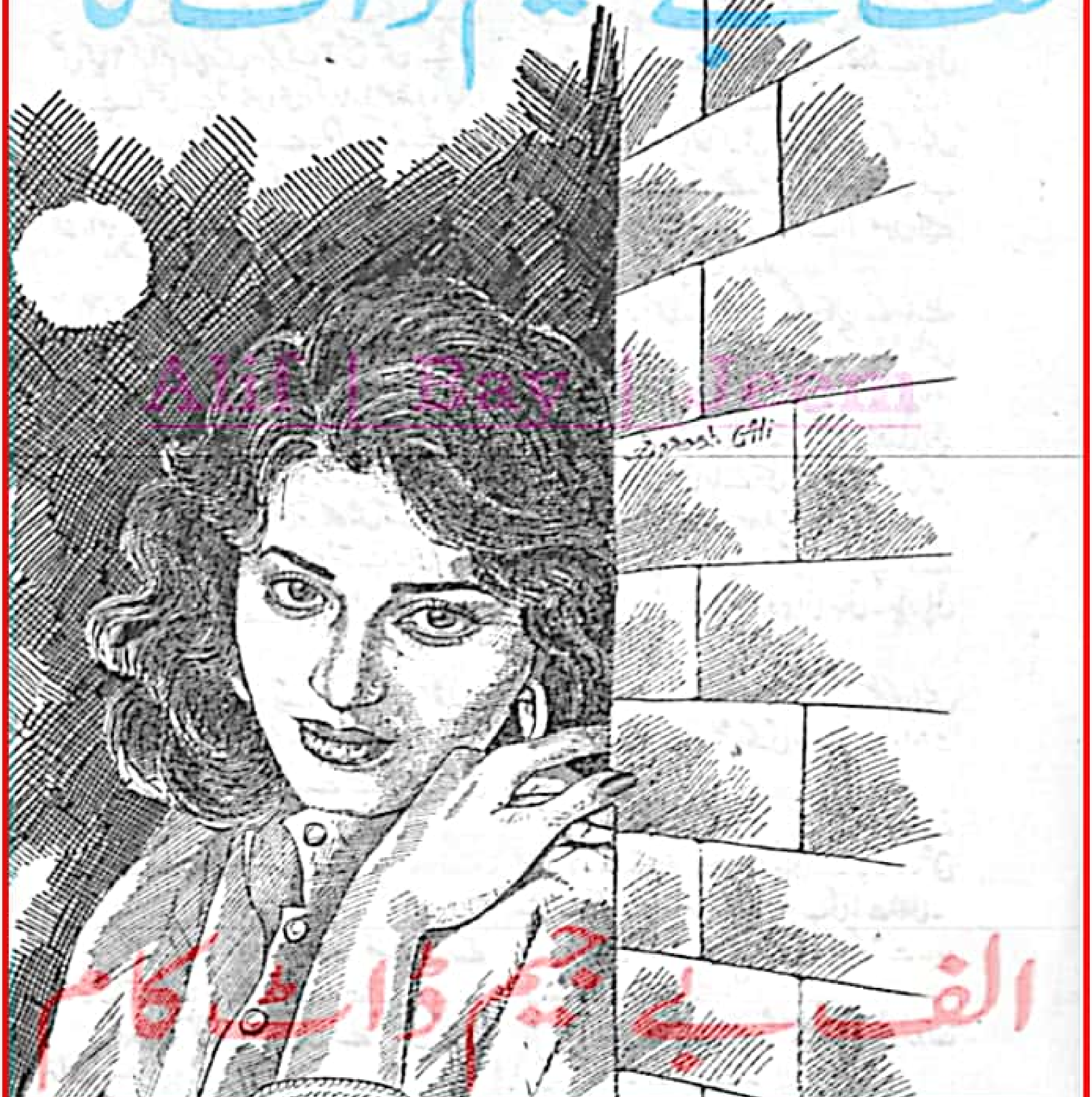

Alif | Bay | Jeem

الف بے جیم ڈاٹ کام

Scanned with CamScanner

"اٹھ رہے ہیں یا جاؤں؟" دھمکی۔

"جا رہی ہو کہ اٹھوں؟" جواب میں دھمکی۔

"میرے اللہ، یہ سارے ریٹائرڈ جج ایسے آلسی ہوتے ہیں یا مجھ بن ماں کی کو بونس ملا ہے۔" وہ باہر نکل گئی۔ ڈنر پر حسن بولتا۔

"ڈیڈی! یہ پچھلے ہفتے انتیس کی ہو چکی۔"

"ہوں۔" ڈیڈی کو لفظ نہ ملتے۔

"کب تک یوں ہی چلے گا؟ اسے یہی جاب ملی تھی کیا؟ کرائم رپورٹس، فیچرنگ؟ صبح تین بجے گھر آتی ہے۔ اٹھتی ہے تو پھر وہی، کردار ڈھونڈو، کہانی کے حقائق...... یہ خطرناک ہے۔ لوگ کہنے لگے ہیں کہ اسے تھوڑا سا ڈر بھی رکھنا چاہیے۔" دبے دبے لفظ، انہونیوں کے وسوسے۔

"تمہیں یاد ہے حسن! میں نے تمہاری کتنی پاکٹ منی حق سمجھ کے خود پر خرچ کروائی ہے؟ کتنی راتیں میری بیماری پر تم جاگے ممی کے ساتھ۔ کتنے دن مجھے بہلاتے ڈھل گئے تمہارے۔ اب بھی میں وہی ہوں بھائی۔"

"اور میں اب بھی تمہاری فکر کرتا ہوں سوما غفران! مگر اب بات میری پاکٹ منی کی نہیں ہے، تمہاری زندگی کی ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا، کیسا لڑکا ہے وہ مرتضیٰ! نہ شادی کا نام لیتا ہے نہ ہی تمہاری نوکری کی نامعقولیت کا۔ مجھے تو اس کے اعصاب بے حس لگتے ہیں جو......"

"پھر وہی......" وہ بیگ، لیپ ٹاپ اٹھائے گھر سے نکلی۔

رات اپنے کوئلہ دانتوں سے ہنسنے لگی اور زندگی بھی......

کہ رات زندگی ہی تو ہے۔

☆☆☆

کہیں بہت دور...... کھیت کھلیانوں کے درمیان بستی اک دنیا پر بچپن جیسی رات اتری تھی۔

کہانیاں سنتی، پرچھائیوں سے شکلیں گھڑتی رات......

مستقبل سے بے خبر...... مستقبل کی فکر میں مبتلا رات......

انہونیوں سے بے خبر...... حادثوں کی سرسراہٹیں تولتی رات......

زندگی بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

کہانیاں سنتی، پرچھائیاں تکتی، بے خبر...... بے فکر۔

تب موسم یوں تھا کہ پکی گندم کو کاٹنے والے کم پڑ جاتے۔ آم کے پیڑ، کوئل کو گود میں اٹھائے کبھی ایک شاخ پر اچھالتے، کبھی دوسری پر۔ ٹھنڈے پانی کے گھڑے بار بار بھرے جاتے۔

وقت کچھ یوں تھا کہ ہل چلاتے بیلوں کو واپس لوٹے گھنٹوں بیت چکے تھے۔ لکڑیوں کے چولہے کب کے دھیمے پڑ چکے، تھکے ہاروں کے تکوے، آنکھوں جیسے بوجھل ہو ہو جاتے، ایسے میں وہ گھر......

وہ گھر کہ جس کے اکلوتے کچے مکان کے سامنے، چارپائیوں کی لمبی قطار میں بستر سے تھکی تھکی خرخراہٹیں آنے لگی تھیں۔ ہاں ایک چارپائی سے دھیمی آواز اٹھتی، دور بیٹھی چالیس واٹ کے زرد بلب تلے آنکھیں پھوڑتی رقیہ آپا کی کڑھائی والی سوئی جانے کیسی مستقل مزاج ہو رہی تھی، جو آپا کی انگلیوں میں سوراخ پہ سوراخ کرتی۔

"سی ی ی...... اماں! آ بھی جا۔ بچے بھوکے سو گئے آج پھر۔" رقیہ یہ کلام دہراتی جاتی۔ چارپائی سے اٹھتی آواز بولتی۔

"کافروں نے کہا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو واپس قریش لاتا ہے، اسے قریش مکہ کی جانب سے سو اونٹ انعام ملے گا۔"

"ابا! پچھلی بڑی عید چوہدری فضل رسول نے اونٹ کاٹا تھا۔" سینے سے سر اٹھا کہانی سنتے ابا کے عاشق بیٹے نے کتنی سے سر اٹھا کر اپنے مطلب کی بات نکالی۔

"اماں نے کڑاہی بھر کے پکایا تھا گوشت۔ یہ مزے تھے ہمارے اور......"

ابا بیٹے کی بھوک جانچ لیتے۔ کہانی روک دیتے۔ کروٹ کے بل لیٹتے۔

Scanned with CamScanner

"سونے! تو ساتھ تھا میرے۔ میں نے جٹوں کے محلے سے کتنا کہا کہ آٹا آج ہی دے دو، مہینہ پورا ہونے میں پانچ دن ہی تو رہ گئے۔"

وہ خاندانی چمار اپنے سات سالہ بیٹے سے گواہیاں مانگتا۔ تب اماں گھر میں وارد ہوئی۔ کسی اونچے جاٹ کی سونے برابر تولی بہو جیسی حسین اماں کے ہاتھ کھانے کے تھیلوں سے لدے تھے۔

رقیہ، آپا کی للکار پر چارپائیوں پر جیسے افتاد کود پڑی۔ بھو کے بچے، بشاش سی پھرتیوں سے اٹھے، کھانا تقسیم ہونے لگا۔

"نی کلثوم! کوئی ان درویشوں کو بھی دیکھ لو۔ باپ بیٹا گند ڈھو ڈھو کے تھک گئے ہوں گے۔" اماں چادر اتار، پاؤں پسارتی چنگھاڑی۔ طنز کے ساتھ خاصی بنتی تھی اماں کی۔

"پانچ محلے، پندرہ گلیاں اور کئی گز لمبی گندی نالیاں...... بیلچہ چلاتے چلاتے ابا ہانپ جاتا ہے۔ کوڑا گاؤں سے بھی باہر لے جاؤ، اماں کیا جانے؟"

سونا سوچتا۔ نوالہ توڑتا باپ کیسا بے زبان تھا۔

"چاکری اور خدمت گزاری میں میرے اور اس عورت جتنا تو فرق ہے ہی، یہ چوہدریوں کی چاکری کرتے ہیں۔ میں خاندانی چماری...... نالیوں سے پلاؤ نہیں ملتے۔ چوہدریوں کے لنگر بہت...... گند ڈھونا آسان لگتا ہے...... زبانوں کے پتھر سہنے سے۔

"غلامے...... اپنا باپ دادا بھول گیا؟" لوگ فیکٹری میں مزدوری کرنے پر پوچھتے۔ "اوقات" یاد دلا دی جاتی۔

"تو گردونواح کے دس گاؤں بھی خرید لے تو رہے گا چمار ہی۔" کوئی ہنس دیتا۔ غلام محمد چماری ہی کرنے لگا۔ بس چماری۔

رات کچھ اور ڈھلی تھی۔

"سونے پتر...... جٹ آٹا دے دیتے تو ہم روٹی کھاتے، اب بوٹی والے چاول کھائے ہیں۔ روٹی ٹھیک ہے یا چاول؟"

"روٹی...... کہ وہ خدمت کا صلہ تھی۔ پلاؤ تو چاکری کا انعام ہے ناں۔" سونے نے طوطے کی طرح اصول دہرا دیا۔ جواباً ہر بار رٹواتا تھا۔ نیند میں اترتا سونا سنتا کہ غلام محمد چٹاچٹ چومتے کہتا۔

"میرا سونا بڑا ہو جائے گا تو فوجی بنے گا۔ یہ وڈا افسر۔ پنڈ والے سلام ٹھوکا کریں گے۔ غلامے چمار کا پتر...... یہ شان سے ابے کی قبر پر آیا کرے گا۔ پنڈ کے سارے بچے اس کی راہ تکا کریں گے۔ یہ پلاہ (پلاؤ) کی دیگیں بٹا کریں گی۔ قبرستان میں اور سونے کا ابا نہیں سے دیکھتا۔ خوش ہوتا ہوگا۔ تو بس میرا سبق نہ بھولنا۔"

غلام محمد کا آٹھواں اور سب سے چھوٹا لڑکا۔ اس کا اکلوتا شاگرد تھا۔ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے ہر معاملے کی سنتیں اور دعائیں وہ چوتھے سال سے حفظ کرتا آیا تھا۔ اسلامی تاریخ کی چیدہ چیدہ جھلکیاں بھی ازبر کر چکا۔ پیٹ بھر چکا تو نیند نے ہر شے سے فکر اٹھالی۔ ابا کے سینے سے چمٹا وہ چمار کی اولاد کسی رات کا شکار ہو جانے کو تھا۔

کہانیوں بھری رات کہیں ختم ہونے کو تھی...... انہونیوں کی پرچھائیاں...... حادثوں کی سرسراہٹیں۔ اماں کی پائنتی پہ رینگتی، ابا کو جھنجوڑتی اور سونے کو خواب دکھاتیں۔

☆☆☆

وہ رات کچھ میٹھی سی تھی۔ 'دینے والی' راتوں میں سے ایک۔ اندھیرے کے سمندر میں جیسے جگنوؤں کا رقص اترا تھا۔

اندھیرے کے سمندر میں جیسے روشنی کی لکیریں کھنچی تھیں۔ اک تصویر بنی تھی...... گویا اک حلقہ بنا تھا...... حلق میں اٹکنے کو پھندا سا۔

رات کسی سیاہ فام جادوگر کے منتر جیسی تھی...... جنت دکھائی...... اور جہنم میں بھٹکائی۔

اس رات، زندگی کی شکل ہو بہو اس رات جیسی دکھی......

میٹھی...... دینے والی۔ جگنوؤں کے پروں جیسی......

Scanned with CamScanner

تصویر پہ نقش تراشتی......زندگی......رات جیسی زندگی......

موسم کچھ یوں تھا کہ بولو تو سانس جم جائے...... سانس لو تو نسیں......

وقت کچھ یوں تھا کہ رات کا پہلا حصہ گزر چکا اور روشنیاں اپنے ہونے پر نازاں پھرتیں۔ اسلام آباد کے پرتعیش کھینے کا پرتکلف منظر، وقت کے ساتھ چلتا......یوں سوما غفران نے دیکھا۔

سوما غفران نے بلیک چاکلیٹ کافی، گرم نرم براؤنیز اور مہنگی ترین کیریمل آئس کریم کو فقط دیکھتے، فون پر انگلیاں چلاتے اور کتاب پڑھتے اس لڑکے کو دیکھا......متنوع کھانے......معروف ترین شخصیت......

مہنگا ترین بین الاقوامی ڈیزائنر ڈنر سوٹ...... چمکتے دبئی کے جوتے، ہیرے جڑی گھڑی، تین قسم کے جیل سے جمے سیاہ چمکتے بال اور صاف سا سانولا رنگ......سوما کی دوستیں بہت سی چھچھوری آہیں بھر چکیں تو وہ اٹھی......دو میز چھوڑ کے بیٹھے اس مہنگے ترین شخص کی میز بجائی، وہ چونکا......نگاہ اٹھائی......

کاش کہ وہ نہ چونکتا......دیکھنے سے ہی تو غضب کا آغاز ہوا۔ کیا تھا دیکھنے میں......آنکھیں......ہاں وہ اس رنگ کی تھیں کہ کوئی رنگ ساز دیکھ لے تو رنگوں کو آگ لگا دے......سمندروں میں بہا دے......کوئی بھی ہرجانہ اس رنگ کی قیمت نہ چکا پائے۔

چیتل سا......شاید سرکہ سے دھلی صراحی سا...... اخیر اپریل کی پکی گندم سا......یا غفران کی لکڑی پر بھنی گندم سا......نہیں، کسی مرتبان میں مشک بار ہوئی زعفران سا...... اور بوجھل ہوئی سرسوں کی پتیوں سا......نہیں شاید جگہ کو گھیرتی صحرائی ریت سا...... یا مریخ کو تابناک کرتی زمین سا......یا......نہیں بات 'رنگ' کی نہ تھی۔ بات تو اس 'بات' کی جو وہ 'رنگ' کہتا...... ہاں وہ رنگ کچھ کہتا تھا۔

''بتا سکتے ہو کہ دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟'' داخلی دروازے کو دیکھتی وہ لندن پلٹ پراعتماد لڑکی بمشکل پوچھ پائی۔

''دل کا دھڑکنا......دھڑک کے ہی جانا۔''

زبان دانوں کی لغت میں شاید ہی کوئی ایسا لفظ، استعارہ، حوالہ ہو جو اتنی سی بات کا اثر ماپ سکے۔ ''اور کچھ؟'' والی نظروں سے دیکھتا وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتا۔ ٹانگ پر ٹانگ جماتا کافی کا پہلا گھونٹ بھرتا۔ وہ مزید تو مزید کہتا۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ اس مشین کا بٹن ہونا چاہیے۔ ٹھک سے بند۔'' کسی پانی میں ڈوبتے...... پاؤں مارتے...... پھندے سے لٹکے...... ہچکیاں لیتے......حالت مرگ کی سسکیاں بھرتے ہوئے جیسے کی خواہش......سوما اپنے ہونٹوں کی سفیدی، ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر پریشان ہوئی۔

وہ پلٹی تو اس شخص کے ڈنر سوٹ کے اودے رومال پر اٹکا اپنا دل جھاڑنا بھول گئی۔

پھر اس رات وہ چینل والوں کی گاڑی سے اتری تو گیٹ میں داخل ہوتے اس نے کسی جلدی میں جاتا اس شخص کو دیکھا۔ ویسا ہی مہنگا ترین......مگر عام حلیہ......سامنے کے بنگلے میں داخل ہوتا......تو وہ اتنا قریب تھا۔ جانے کب سے...... وہ اندھیروں میں ڈوبا بنگلہ دیکھتی سوچتی۔

رات اپنے منتر پھونکتی رہتی۔ الف لیلوی جادوگروں سا ہنستی رہتی۔ یوں کہ سوما غفران اپنے ہاتھوں میں وہ انگوٹھی دیکھتی۔ جو اندھیرے بنگلے کا شاہ زادہ اسے پہناتا اور گھنٹوں اس ہاتھ کو دیکھتا۔

☆☆☆

وہ رات قیامت کے آنے کا پتا دیتے منظروں سی تھی۔

وہ رات صور پھونکے جانے جیسی تھی۔ ہیبت، افراتفری، نفسانفسی، اور بے یقینی جیسی۔

اندھیرے کے سمندر میں جیسے زہر اڑا تھا۔ یوں کہ سانس لیتا ہر نفس اسے خود میں اتارنے پر مجبور تھا۔

اندھیرے کے سمندر میں پھر کوئی بڑی بلا آئی تھی اور چھوٹی مچھلیوں کے گھروندے، بھر بھرے نکلے تھے۔

اندھیرے کے سمندر میں کچھ پیش گوئیاں اپنے سچ ہونے پر بین کرتی پھرتیں۔

تب زندگی بھی تو اسی رات جیسی تھی...... قیامت ہوتی...... زہر ہوتی...... بڑی بلا کی زد میں آئی...... پیش گوئیوں کو سچ کرتی زندگی......

رات جیسی سیاہ پڑتی زندگی......

موسم کچھ یوں تھا کہ زمین نے اپنے دہانوں سے آگ جیسی سانسیں چھینکی شروع کردیں۔ سال کا آٹھواں مہینہ ختم ہونے کو تھا......

وقت کچھ یوں تھا۔ اندھیرے اترے بھی گھنٹوں گزر گئے۔ ہاں وقت تو نزع جیسا ہی تھا۔

غلام محمد نے آج نالیوں کا گند صاف کیا مگر ہاتھ نہیں...... لباس وہی باس مارتا، بچے کونوں میں دبکے پڑے۔ رقیہ آپا اندر آتی۔ باہر جاتی۔ بس روئے جاتی...... جبڑا بھینچ بھینچ کے آہیں دباتی۔ اور اماں...... وہ ادھ مرے کی طرح کراہتی...... نیل و نیل جسم کو گھسیٹتی...... خود کو چھپانے کی جگہ ڈھونڈتی۔

"غلام مجھے سونے کی قسم...... میں نے نہ کیا چوری وہ کنگن...... کس کام کا تھا وہ...... چوہدری مجھے خود پہنائے جاتا۔" وہ دھاڑیں مارتی۔ ابا گھٹنوں میں دیا سر نہ اٹھاتا۔ وہ خود سنبھلتی...... خود سے پھر شروع کرتی۔

"چوہدرائن مزارعوں سے میری تلاشی کرواتی۔ غلاے میں نے کی (کیا) کرنا تھا وہ کنگن......" وہ زخم دکھاتی...... نیل، اکھڑی داتر اروان......

"ہمیں جھونکتی ہیں اپنے مردوں کے آگے...... پھر ہمیں ہی ان کی نیتوں کے فتور بھرنے پڑتے ہیں۔" وہ غصہ میں جاتی۔ غلام محمد سونے کو بازو پہ لٹاتا۔ کان میں بولتا۔

"سونے، میری اماں بھی بچے تھیلے لایا کرتی تھی مالکوں کی حویلی سے...... یوں کہ میرا باپ پورے پنڈ کے لیے بے غیرت، ہم حرامی ہوگئے۔ حرامی آج بے غیرت اور تو حرامی ہوگیا ہے۔ ماں، بہن، بیوی، بیٹی...... ہم چمار رہتے ہیں...... اور ہماری عورتیں بھی دھتکاری نہیں جاتیں...... یہ ہمیں مردہ مانتے ہیں پتر...... گند ڈھوتے غلام......"

ابا ذبح ہوتی گائے سا ڈکراتا۔ سونا ابا کا سینہ ملتا، بازو سہلاتا...... جانے کیوں روئے جاتا۔ گہرا سانولا غلام محمد، سونے کے لیے تو ہر زاویے کا محور تھا۔ اسکول جاتا تو ہائے ابا کہتا روتا رہتا۔

چوٹ لگتی تو ہائے ابا نکلتی...... باپ نالیوں میں گھر پہ چلاتا...... وہ صاف کپڑے یا اپنی قمیص کے دامن سے باپ کا چہرہ صاف کرتا رہتا...... بنا کچھ باقی سات کیچڑ کی بو سے خار کھاتے، ناک منہ چڑھاتے بس وہ اکیلا تھا...... ابا کے رنگ سا 'سونا' جس کا ابا ہی سب کچھ تھا۔

"سونے! سب سے اچھا رزق کون سا ہے پتر؟" سونے کو لگا ابا نہیں کوئی اور بولا ہے...... خوف زدہ سا بچہ سبق دہراتا رہا۔

رات کے کسی پہر وہ چھر ہوئے ابا سے ٹکرایا تو آنکھیں کھول کھول کر سیدھے پڑے ابا کو دیکھتا رہا پھر وحشت سے چیخا۔

"ابا...... آپا...... اماں۔" وہ گھڑی تھی جو سب نگل گئی۔

سونے کا عشق...... مستقبل...... زندگی...... سیاہی کے سمندر میں بین پاگل ہوئے پھرتے...... سونے کی یتیمی ہر آنکھ رلا گئی۔

زندگی رات جیسی ہوگئی۔ زہر قیامت جیسی زندگی......

☆☆☆

وہ رات کالی نہ تھی...... وہ رات زہری نیلی تھی۔

سیاہی کے سمندر میں کسی شیش ناگ کی پھنکار سنائی پڑتی۔

سیاہی کے سمندر میں وہ منظر سچ ہوتا کہ جس میں ابلیس سنپولیا ہوتا اور آدم وحوا شکار۔

سیاہی کے سمندر میں تیرتی بھوک چھوٹی

مچھلیوں کو بے خبر رکھتی ہر گھات سے...... وہ رات زندگی کو مزید دلدل کرنے والی تھی۔
تب زندگی بھی تو ایسی ہی تھی۔
زہری نیلی...... ابلیس کا شکار...... بھوک کی کسی ماری ہوئی...... موسم کچھ یوں تھا کہ ادھر ساون کو تیزی پڑی ہوئی۔ ادھر سورج ضد کا پورا، ہوا میں چلتیں مگر مرتبانوں کے تھک تھک نم رہتے۔ وقت یوں تھا کہ ساعتیں گزریں۔ پور اگاؤں سوچوں سے خواب دیکھتا...... کوئی رومانوی...... کوئی ہیبت ناک...... کوئی ڈرامائی......
غلام محمد کی اولاد کو آج پھر بھوک سونے نہ دیتی اور نیند اٹھنے نہ دیتی...... رقیہ کی نگار انگلیاں اسے روز محشر جواب دہی کی دھمکیاں دیتیں مگر وہ سوئی چلائے جاتی...... سب سے بڑے اکرم نے مزدوری کے ساڑھے تین سو لا کر دیے تھے مگر......
وہ اماں سے چمٹا...... ابا کا سبق دہراتا۔ رشتے کی خالہ سلطانہ، اماں سے تعزیت کرنے کے بعد ہلکی آواز میں بولتیں۔
''سیٹھ جی لڑکیوں کی واپسی کی گارنٹی دیتے ہیں۔ یہ چھ مہینے کا دبئی کا چکر اور یہ بدلے بیچے والوں کے حالات، عزت تو تیری رہی کوئی نہ...... ان بلونگڑوں کی آنتیں بھوک سے سکھا کر تجھے کون سا عزت داری کے تمغے مل جانے۔ میری فوزی لگا کے آئی ہے ایک چکر، غسل خانہ یہ چم چم کرتا بنوایا ہے۔ دو کمرے بھائی کو بنوا دیے لینٹر ڈال کے۔
اب پھر جانے کی تیاری کر رہی ہے۔ یہ کانٹے (بالیاں) بنوا دیے مجھے اور......'' سونے کو اچھے رزق کے سبق بھول گئے۔ وہ اماں اور سلطانہ خالہ کو اکلوتے کمرے میں جاتا دیکھتا۔ خالہ کوئی نمبر ملاتی۔ معاملہ طے کرتی۔ اگلے دو دن اماں، بڑی دونوں آپاؤں کو لیے سمجھائے جاتی۔ وہ روئے جاتیں...... اماں تھک جاتی تو روئے جاتی۔
سونے کا ابا کہتا تھا کہ غریب روزہ رکھ لے تو دن لمبا ہو جائے۔ زندگی مزید دلدل ہوئی کہ ایئرپورٹ کے راستے میں سیٹھ جی کے مخالفین نے گاڑی پر حملہ کر دیا۔ سب مارے گئے۔
آدھے پورے کپڑے پہنے، میک اپ زدہ چہرے اور رنگین بالوں والی آپاؤں کی لاشیں پولیس گھر چھوڑنے آئی تو جنازے اٹھانے کو چار لوگ نہ ملتے کہ اماں اور اکرم تو جیل میں جا پہنچے۔
زندگی شاید رات سے بھی بدتر ہوگئی۔ زہر سی...... کسی شکاری...... دلدل سی۔
☆☆☆
اس رات کے سینے پر جیسے سات زمینوں اور ان زمینوں پر بستے لوگوں کے گناہوں کا بوجھ تھا۔
سیاہی کے سمندر میں ایک دکھ دبا پڑا تھا جو سینے کو پھوڑا بنائے جاتا...... سیاہی کے سمندر میں مباحثے گچھے دار ریشم الجھے جاتی اور یوں امید ناپید ہوئے جاتی۔
سیاہی کے سمندر میں محبت دکھائی پڑنے کی ضد ہونے لگی...... جو پوری نہ ہوئی۔
زندگی بھی اس رات کے ریشم سے الجھ پڑی تھی۔
دبا ہوا دکھ...... کمزور کرتے دلائل...... محبت اور ضد...... زندگی ان ہی موضوعات کے گرد گھوم رہی تھی۔
موسم وہاں کچھ یوں تھا کہ دھند، اندھا دھند تھی...... کڑاکے کا جاڑا ہر شے کو جما دینے کے درپے تھا۔ روشنیاں، گھاس میں چھپے جگنوؤں جیسی دمکتیں۔
وقت کچھ یوں تھا کہ رات کے کھانے کھائے جا چکے۔ اس شہر امراء و رؤساء میں لوگ دوسرے پہر کی رات میں خوش و خرم پھرتے......
بوگن ویلیا تلے دبے اس بنگلے نے آج پھر رات کے کھانے پر وہی مباحثے سنے۔ حسن کا اپنے باپ کی غفلت کو کوسنا...... سوما کو جھنجھوڑنا...... مرتضیٰ کا شعوری گریز زیر بحث لانا۔ بھابھی کا بنا کسی دلچسپی کے رغبت

Scanned with CamScanner

سے بریانی کی تعریفیں کیے جانا، سب کچھ اعصاب کو روز بروز دیمک لگی لکڑی جیسا کرتا جاتا۔

آج انتیس روز بعد سوما غفران کو پھر ڈپریشن ہوا تھا۔ اس کے باپ کو اس کی نوکری پسند نہ تھی۔ اس کے منگیتر کا تاریک بنگلہ پسند نہ تھا۔ (سوما! وہ روشنیاں بجھا کے رکھتا ہے، وہ میرے تہجد کے وقت بھی بالکونیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے، وہ ذہنی بیمار ہے)

اس کے بھائی کو سوما کا رات گیارہ بجے کا کرائم فیچرنگ پروگرام اور رات تین بجے واپسی پسند نہ تھی۔ منگیتر تو سرے سے ہی پسند نہ تھا۔ (اتنا مال دار لڑکا اتنا ہی اکیلا ہے۔ یہ عجیب ہے۔ اس نے مہنگی چیزوں سے خود کو اتنا سجا رکھا ہے کہ تمہیں اس کی شخصیت کا معمولی پن نظر ہی نہیں آتا۔ وہ مجھ سے آنکھ ملا کے بات نہیں کر پاتا سوما! وہ خوف زدہ بچہ دکھتا ہے۔

بھائی اپنی فہرست بنا کے بیٹھا تھا۔ ادھر وہ مرتضیٰ کو چھوڑتی، وہ قطار لگا دیتا۔

اس کی بھابھی کو اس کے ہار جانے کا انتظار تھا۔

تنہائی عود کر آئی۔

ہفتے کی شام کی فراغت تھی۔ سو وہ کمرے میں بند ہو کے خوب روئی۔ کیونکہ وہ جو کسی کو پسند نہ تھا۔ سوما کو اس کے سوا کچھ پسند نہ تھا۔ وہ ہرگز معمولی نہ تھا۔ کسی نے وہ بات ہی نہ سنی تھی جو اس کی آنکھیں کہتیں۔

کسی نے اسے مسکراتے جو نہ دیکھا تھا۔ کسی نے اس کے ابرو کا ناراضی سے اٹھنا جو نہ سہا تھا۔ کسی نے اس کے ہونٹوں میں دبی باتوں کو پڑھا جو نہ تھا۔ کسی نے اس کا کتابوں سے عشق جانچا جو نہ تھا۔ کسی نے اس کا ہر تین ماہ بعد اپنی مہنگی چیزوں کا بانٹنا دیکھا جو نہ تھا۔ کسی نے اسے یتیم خانوں کی کفالت کرتے اور بوڑھے مزدور کی موت پہ پھوٹ پھوٹ کے روتے دیکھا جو نہ تھا...... کسی نے اسے محبت کرتے دیکھا جو نہ تھا۔

وہ معمولی نہ تھا۔

وہ آنکھیں خوب ساری سجا چکتی تو اپنے سیل فون پہ آیا برقی پیغام پڑھتی۔

"کیا تمہیں ذکر پراٹھا بنانا آتا ہے؟" وہ لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگی۔

چوکیدار اسے دیکھ کے دروازہ کھولتا تو وہ شرمندہ سی ہوتی۔ پورا گھر تاریک تھا۔ اوپن ایئر کچن روشن تھا مگر سوما نے ہاتھ مار کے ہر بلب روشن کر دیا۔ مرتضیٰ چونک کے پلٹا۔ بغور سوما کو پڑھ لیا اور پلٹ کے فریزر سے کچھ نکالنے لگا۔ ایپرن باندھے! شرٹ کی آستین فولڈ کیے وہ غیر معمولی ترین دیکھتا۔ سوما کاؤنٹر کے ساتھ پڑے اسٹول پہ بیٹھتی اسے دیکھے گئی۔

مرتضیٰ نے دو کافی کے مگ کاؤنٹر پہ رکھے، بلیک فارسٹ کیک پہ لگی موم بتی جلائی اور اس کے سامنے اسٹول کھینچ کے آ بیٹھا۔

پرکشش سا مسکراتا وہ سوما کو چھری تھماتا۔ یقین کیجیے۔ وہ مسکرانا چاہتی مگر ناکام رہتی۔ سوما اسے کیک کا ٹکڑا کھلاتی تو وہ ہمیشہ سا مصروف بولتا۔

"تمہاری سالگرہ مجھے یاد تھی مگر میرا گفٹ کچھ لیٹ تھا۔" وہ کیبنٹ سے گفٹ کیس نکالتا۔

وہ ایک پینڈنٹ تھا۔ ڈیڑھ انچ لمبا اور چوڑا۔ شیشے پہ ایک رنگین منظر کھدا تھا۔ مرد نے عورت کی گردن میں بازو ڈال رکھا تھا اور وہ عورت کے پیچھے کھڑا، اس کے سر سے سر ٹکائے نگاہیں جھکائے ہوئے تھا۔ وہ دونوں کسی وجد میں دکھتے۔ ایک طرف بہت چھوٹا سا Ecstacy (وجد) لکھا تھا۔ سوما نے انگوٹھے سے اس چھوٹی تصویر کو چھوا اور آنکھیں جھپک جھپک کر خود کو شکریہ کہنے جتنا تیار کیا۔

"ڈیزائن کروایا ہے؟" پوچھنے لگی۔

"تب ہی تو اتنے دن گزر گئے۔" کاؤنٹر پہ بازو ٹکا کے کافی پیتے لڑکے جواب دیا۔

"ہونہہ۔" "فرمائش...... وہ بے بس سی بیٹھی رہی۔

"یہ ایک نظم کا خیال ہے۔ Ecstacy

Scanned with CamScanner

سولہویں صدی کے انگریز شاعر ڈن (Done) کی نظم۔"

"یہ کیسی فرمائش ہے مرتضیٰ؟" وہ پینڈنٹ لہرا کے بولی۔ تحسین مرتضیٰ ہونٹوں پہ مٹھیاں جمائے اسے تکتا۔ وہ بہت دیر خاموش رہی۔

"تم مجھے اپنے گھر میں لے آؤ پھر چاہے جیسی بھی حد بندی لگا دو۔ مگر میرے گھر والوں کے سامنے مجھے بے وقعت مت کرو۔" وہ رک رک کے بولتی کہ آج اسے یہ معاملہ ختم کرنا تھا۔

"تم نے کب کہا تھا کہ اک دو جے کو دور سے دیکھنا ہے فقط۔ اب یہ شرطیں کیوں رکھتے ہو؟" وہ بے بس سی ہوتی۔

"میں نے تمہیں اپنی ستائیسویں سالگرہ پہ دیکھا تھا۔ یہ میری تیسویں سالگرہ ہے تحسین مرتضیٰ اور تم مجھے سمجھاتے ہو کہ محبت کا جسم نہیں ہوتا۔ محبت میں کہیں جسم نہیں ہوتا۔ مرتضیٰ...... محبت میں معاشرہ تو ہوتا ہے ناں جو رات کے پہروں میں کسی لڑکے کے گھر کا دروازہ پار کرتی لڑکی کو اچھا ہرگز نہیں کہتا۔ ماں باپ بھائی تو ہوتے ہیں ناں جو ساری عمر اپنی لڑکی کا گھر بسانے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ کچھ خواب تو ہوتے ہیں ناں جو لڑکی ہر صورت دیکھتی ہے۔"

تحسین مرتضیٰ کے ماتھے پہ نمی چمکنے لگی تھی۔ مٹھیاں سختی سے ہونٹوں پر جمی تھیں۔ سوما غفران کو اپنا آپ ارزاں لگا۔ بہت ارزاں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے سکون تک تم سے پیارا نہیں مگر عزت نفس تو حق ہے میرا۔ تم مجھے قیمتی چیزوں سے مت سجاؤ مجھے گردن میں یہ پینڈنٹ نہیں، تمہارا بازو سجاتا ہے۔" وہ Ecstacy کا منظر دکھاتی بولی۔ پینڈنٹ وہیں دھرا تھا۔ مرتضیٰ کا کافی کا کپ...... بلیک فاریسٹ کیک اور وہ خود بھی وہیں تھا۔ سوما غفران جا چکی تھی۔ بوجھل رات مزید وزنی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اس رات کی بڑی مشکل سی شکل تھی۔ نئے امتحانوں میں مبتلا کرتی رات...... تاریکی کو مزید گہرا کرتی رات۔

سیاہی کے سمندر میں لاشعوری محرومیوں کی بھرپائی کرنے کی کوششیں ہوتیں۔ سیاہی کے سمندر میں گناہوں کی وضاحتیں ہوتیں۔ بے گناہ مہروں کے ذریعے۔

زندگی نے رات جیسا تماشا رچایا تھا۔ عریاں گناہ...... وقتی اطمینان اور بھیڑیوں سی بربریت زندگی کو اس رات جیسا کرتی۔

موسم کچھ یوں تھا وہاں کہ بادلوں نے عجب ہلا مچا رکھا تھا۔ لاہور اب بارش کی شدت سے کچھ گھبرایا ہوا لگتا۔

وقت کچھ یوں تھا رات کے دو پہر گزر چکے تھے۔ ہولنا کی کا سماں تھا۔ وہ جوابا کا سونا تھا وہ بے آرامی سے زمین پہ بچھے گدے پہ کروٹیں بدلتا یہ سات سال بعد والا سونا تھا...... چودہ سالہ، چونکا دینے والی اٹھان والا سونا...... امراء کے بچے سنبھالتا بہلاتا سونا۔ یہ چوتھا بنگلہ تھا پچھلے چھ سالوں میں۔ ابا اور باجیوں کے بعد وہ یونہی ریت سے بکھر گئے تھے۔ سب کے سب مزدور ہو گئے تھے۔ گھر دیکھے سالوں گزر جاتے۔

اس بنگلے میں آئے دوسرا ہفتہ تھا۔ دو بچوں کو سنبھالنا تھا۔ پاگل سے بچے، انتہائی بدتمیز سے۔ بادلوں کی گھن گرج سے بچے بے آرام سے تھے۔

وہ دودھ گرم کرنے کچن کی طرف آیا تھا۔ لاؤنج کے صوفے پر مالکن نوشین سے خاصی بے تکلفی برتتا اک انجان مرد تھا۔ مالک تو کسی دوسرے شہر میں تھا۔ نیم تاریکی، تڑتڑ برستی بارش، کمرے میں روتے بچے اور صوفے کا منظر سونے کو مفلوج کرتا۔ خوف میں وہ کسی گلدان سے ٹکرایا تھا اور باجی نے چیل کے جیسی تیزی سے پلٹ کے اسے دیکھا۔ پھر درشتی سے دفعان ہو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بلوغت کے پہلے وحشت زدہ اتفاق کا شکار ہوا تھا۔ کتنے دن گھبرایا پھرتا۔ پھر وہ جاتا گیا۔

نوشین حسین عورت تھی۔ کسی غریب خاندان

سے۔ ابا کی فیکٹری کے مالک کو پسند آ گئی تو دولت نے جیسے ثقلین رضا کے ہر عیب کو خیرہ کر دیا۔ دولت کی بے سکونی سے متعارف ہونے کے بعد نوشین رضا نے سب سے پہلے اپنے اندر اٹھتے غبار کو گناہ کا رستہ دکھایا۔ بے ڈھنگے وجود اور کم صورت والے ثقلین رضا کی دولت ...... نوشین رضا کی خوب صورتی جمع ہو کر تباہی لانے لگی۔ ثقلین رضا نے یہ سواڑ لیے کہ کوئی چارہ نہ تھا۔ نوشین جاتی تو نہ صرف گھر ٹوٹتا بلکہ بہت سے کاروباری ساتھی بھی روٹھ جاتے۔ یہ تو سونا تھا جو ڈر گیا تھا۔

نوشین کھاگ تھی، وہ کم عمر...... وہ دست درازی کرتی، وہ سمٹتا، گھٹتا...... روتا...... اماں کو فون ملاتا باجی چھین لیتی۔

"دیکھو حلیمہ! یہ چودہ سالہ لڑکا پندرہ ہزار کا پڑتا ہے مجھے۔ میں نے کبھی شکایت کی؟ تمہارے لیے دو ہزار اور بڑھا دیتی ہوں مگر یہ مجھے مزید تنگ نہ کرے۔ بچے بہل گئے ہیں اس کے ساتھ۔" وہ سونے کا گال سہلا سہلا کے فون پہ کہتی۔

"اچھا رزق کون سا ہے؟" سونے کو سبق بھولنے لگا۔ وہ سمجھ نہ پاتا کہ اس کا کمایا رزق اچھا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اچھا رزق کون سا ہوتا ہے۔

راتوں پہ راتیں گزرتیں۔ وہ نوشین باجی کا گواہ ہوئے جاتا۔ ڈرتا جاتا۔ راتیں عریاں کرتی حقیقتیں بنی جاتیں۔

☆☆☆

پھر سے وہی رات کا رچایا سوانگ۔

اس رات برقی قمقمے اندھیرے کو ہرانے لگے تھے۔ سیاہی کے سمندر میں بے باک قہقہے اور لذیذ اشیا گھومتیں، امراء کا جمگھٹا اور دکھاوے کا عروج۔

موسم ہلکا گرم تھا ...... یوں کہ ریشمی لبادے فوقیت پہ تھے ابھی ...... وقت رات کی آخری گھڑیوں میں سے تھا۔ بچے تک پارٹی کے ہنگامے میں بھاگے پھرتے۔

ثقلین رضا کی کمپنی کی سالانہ پارٹی تھی۔

نوشین باجی ہر کونے کھدرے میں ثقلین صاحب کے ایک تازہ تازہ بنے وکیل دوست کے گرد گھومتی پائی جاتیں۔

سونا بچوں کو بہلاتا۔ بالترتیب چھ اور چار سال کے بچے۔

ہنگامے سرد پڑ گئے تو ثقلین صاحب اپنے چیدہ دوستوں کو لیے کارڈز کھیلنے لگے۔ افرا ہیم کہیں جا چھپا اور سونا اسے ڈھونڈنے نکلا۔

بالائی منزل کا اسٹور نیم تاریک تھا۔ پرانی چیزوں سے اٹا پڑا۔ کچھ بے کار فرنیچر، کپڑوں کے بکسے، ردی کتابیں، سونا وہاں کتابوں کے لالچ میں کئی بار آیا تھا۔ ابھی بھی اسے لگا کہ افرا ہیم سا پارہ صفت کسی بھی جگہ چھپ سکتا ہے۔ وہ یک لخت اندر گھس آیا۔

نوشین باجی نے اسے کینہ توز نظروں سے گھورا۔ وکیل صاحب کچھ بوکھلائے تھے۔ بوکھلا کے پلٹے تو کچھ سامان سے ٹکرائے۔ وہ سامان دھڑ دھڑ گرنے لگا۔ سونا انتہائی گھبرایا۔

"غلطی ہو گئی باجی جی۔" وہ پلٹنے لگا۔

"ہاں تو پھر غلطی کی سزا تو بھگتتے جاؤ۔" وہ سونے پہ جھپٹیں۔

"ہر بار فرشتے سا نازل ہو کے معصوم بن جاتے ہو ناں۔ کچھ دیر تڑپو تو شاید دماغ کی کچھ رگیں کھل جائیں تمہاری۔" وہ اسے شیشے کی سلائیڈنگ وارڈ روب میں بند کر کے غصے سے نکل گئیں۔

"بچ گئے تو قسمت، مر گئے تو تمہاری ماں کو پچاس ہزار ہی بہتر لگے گا کسی اور چکر سے۔" وہ کچھ دیر کو سہم گیا۔

جب سانس لینا دشوار ہونے لگا تو سہم افراتفری کے آگے گھٹنے ٹیک گیا۔

اب وہ تیزی سے اس موٹے شیشے کو پیٹنے لگا۔ پکارنے لگا۔ گھر کے ہر مکین، ہر ملازم کو۔

"باجی! میری غلطی نہ تھی۔ وہ تو افرا ہیم کہیں جا چھپا۔" وہ کھانسنے لگا تھا۔ ہولے ہولے اس شیشے کے

تابوت میں کاربن اکٹھی ہونے لگی، آکسیجن ختم۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

ایڑی کسی کونے پہ لگی اور خون تیزی سے جگہ رنگین کرتا رہا۔

وہ کبھی ہمت چھوڑ دیتا اور خود کو پتھر کر کے موت کی چاپ سننے کی کوشش کرتا۔ کبھی پوری جان سے اس شیشے کی دیوار کو مخالف سمت دھکیلتا۔ پھر اسے چیدہ چیدہ لوگ یاد آئے۔

گاؤں کے اسکول کا ماسٹر...... وہ روز حدیث سناتا۔ کبھی نہ مارتا۔

رقیہ آپا...... اپلوں کی آگ پہ پھونکیں مارتی، کچی دیواروں پہ مٹی کا لیپ کرتی...... سوئی دھاگہ اور فریم پکڑے۔ وہ سونے کے لیے رونے والی اکلوتی انسان تھیں شاید۔

سمیرا باجی جو سونے کو اپنے بچوں کی کتابیں پڑھاتیں دو چاکلیٹ اپنے بیٹے اور ایک سونے کو بھی دیتیں۔ ان کا بنگلہ کم خوب صورت تھا جانے کیوں وہ امریکہ چلی گئی اور سونا کسی سونامی کی لپیٹ میں آیا نوشین باجی کے بنگلے پہ پہنچ گیا۔

ابا...... کم صورت، کم ذات غلام محمد...... عظیم تر، محنتی، ایمان دار، باغیرت مومن...... سونے کا باپ۔ وہ چھوٹا تھا، بلی سے بہت ڈرتا تھا۔ ڈر کے ابا سے لپٹتا تو سادہ سے ابا ہنسے جاتے۔ شرارت سے اسے خود سے دور کرتے، وہ اور زوروں سے لپٹتا۔ وہ جلیبی مانگتا۔ ابا گڑ دیتے۔ اچھا رزق وہی جو میسر آ جائے۔ جو میسر ہو...... جو اطمینان بھر دے خود میں۔

سونے کے ناخن، ہونٹ، ہاتھ نیلے پڑ گئے تو ملازم نے اس قبر کا دروازہ چاک کر سونے کو واپس دنیا میں کھینچ لیا۔ نزع کی سختی وہ سہہ چکا تھا۔ یہ آخری ہمدردی نہ دکھائی جاتی تو وہ سرخرو ہو جاتا مگر آفتوں کو اس کا مرنا منظور تھوڑا ہی تھا۔

وہ کسی آفت کا شکار ہوا۔ سانس درست کرتا، زخمی پاؤں اور چور چور وجود کے ساتھ ثقلین رضا کے سامنے جم کے کھڑا ہو گیا۔

وہ روتا، ثقلین رضا کو نوشین رضا کی بیلے سے معلوم حقیقت بتاتا تو دوستوں میں موجود ثقلین رضا کے پاس کون سا رستہ بچتا تھا بھلا؟

وہ سونے پہ ہی ٹوٹ پڑتا۔ ایک غریب، نوعمر لڑکا، ثقلین رضا کی برسوں کی ساکھ کے آگے کیا تھا بھلا؟ وہ دو چار قیمتی چیزوں کی چوری سونے کے سر ڈال کے اپنے تھانے دار دوست کو فون ملاتا۔

یوں نہ زلزلہ آتا...... نہ طوفان، نہ زمین شق ہوتی۔ نہ سیلاب کچھ غرق کرتا۔ وہ مظلوم زخمی پاؤں اور نیلے بدن کے ساتھ پولیس وین میں بیٹھا اپنی ہتھکڑیاں گھورتا رہتا۔

رات کا رچایا سوانگ...... سونے کی معصومیت کی آخری پرت بھی پھاڑ گیا۔ رات کا انجام کئی راتوں سا بھیانک ہی رہا۔

☆☆☆

وہ رات کسی سرکس سی رنگین تھی۔

وہ رات کسی رقاصہ کے ٹخنوں سے چمٹے بناہ گزیدہ گھنگھروؤں سی شوریدہ تھی۔ وہ کھنک سی چنچل ادا والی رات تھی۔

سیاہی کے سمندر میں اک بے رنگ سر اٹھا، پنڈال پاگل کرتا ہوا سر...... سیاہی کے سمندر میں ارزاں سے تیرتے پھرتے کاغذی ناخدا......

سیاہی کے سمندر میں مٹ جاتی ہر تہذیب کی روشنی۔ ہر تمدن کی حد۔ سیاہی کے سمندر میں کمزور پڑ جاتے ڈراوے آخرت کے......

سیاہی کے سمندر میں بھوک، بغاوت کی لہریں اٹھاتی اور لے جاتی...... نافرمانیوں کے جزیروں پر...... اچھا رزق حرف تنسیخ بنے رہتا۔

پس زندگی بھی ایسی ہی تھی۔ گھنگرو، سر اور پاگل ہوتے پنڈال جیسی جہاں کاغذ قدموں تلے روندے کے بھوک مٹائی جاتی اور ہر ترقی انسانی جبلت کا منہ دیکھتی رہ جاتی۔

آتی بہار کے موسم میں...... رات کے وقت۔ وہ کئی پھٹی ایڑی گھسیٹتا، جیل سے نکلتا اور چلتا ہی

جاتا......

ایسے میں دور کہیں شہنائیاں گونجتیں...... کسی کی خوشیوں کا سے ٹھہرا ہوتا۔ بھوک اسے کہیں بیٹھنے نہ دیتی...... سوچنے نہ دیتی، چلنے بھی نہ دیتی۔ نہ ہی مرنے...... شہنائیاں قریب آتی جاتیں۔ لوگوں کا جمگھٹا ڈھول تاشے، رنگ اور روپے...... ہوا میں تیرتے وہ کاغذ، زمین پر اترنے سے پہلے اچک لیے جاتے۔ وہ سخت جان چمار میدان میں اپنی بھوک سمیت اترا تو کسی اور کو نوٹ اچکنے کی مہلت نہ ملی۔ بری طرح گرتا، پڑتا، پھر اٹھتا اور مٹھیاں بھرے جاتا۔

یوں ہی کسی نے اسے دیکھا اور ذہن میں جمع تفریق شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر میں وہ سونے کو ڈھابے کی دال اور تندوری روٹی کھلاتے کہتا۔

"میں کامی ہوں۔" آگے کی کہانی اسے کامی کے گھر میں سنائی جاتی۔ وہ چار کا گروپ تھا...... تنو مند، اچھی شکل و صورت والے تگڑے سے لڑکے......

سہیل سب سے خوب صورت تھا۔ پڑھا لکھا بھی، کالج ڈرامیٹک سوسائٹی کا لیڈر...... چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی...... یہی خرابہ نکلا...... وہ پچیس ہزار کماتا گھر میں تیس کی ضرورت ہوتی۔ بڑی بہن کی عمر اڑ میں ہوئی اور اماں جہیز نہ جوڑ سکیں۔ ہر گزرتا فقرہ کسنے لگا۔ گھر کا ہر فرد نیم پاگل ہونے لگا، مباحثے، چیخ پکار، خود غرضیاں، پھر اسے کامی ملا۔ وہ سہیل کی اچھی شکل کو داد دیتا۔ لالچ بھی، یوں سہیل اس گروپ میں آن ملا۔

پھر مدثر تھا۔ دراز قامت، خوبصورت جسم والا، تایا زاد کو چاہتا تھا، اتنا کہ بازوؤں پر کوئی ایسی جگہ نہ بچتی جہاں اس کا نام نہ کھدوایا ہوا ہو۔

بات صرف اتنی ہوئی کہ تایا کا بیٹا سعودیہ گیا اور تایا کے ہاں یہ ریال آنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کوٹھی بن گئی۔ دوسرے دو بھائی بھی سعودیہ جا پہنچے۔ اکلوتی لڑکی کے رشتے دیکھے جانے لگے۔ مدثر پاگل ہوتا جاتا۔ "کہاں سے بناؤں اتنی بڑی کوٹھی؟" وہ

کامی سے آملا۔ گروپ میں سب سے محنتی تھا یہ......

سرفراز کے ساتھ سب سے برا ہوا۔ اس کا بڑا بھائی خاندانی دشمنی کی نذر ہو گیا تو باپ نے ساری زمین بیچ کے اس کے لیے کینیڈا کا ویزا خریدنا چاہا ایجنٹ فراڈ نکلا اور ابا دل کے مریض ہو گئے۔ وہ حالات سے تنگ آ گیا۔ مرنا چاہتا مگر مدثر نے اسے ویزا خریدنے کے لیے پیسے بنانے کا لالچ دیا اور کامی کے گروپ میں شامل کر لیا۔

ہاں کامی کو حالات نہیں بلکہ اخلاق بجی یہاں تک لائی۔ وہ ایک درزی تھا۔ لڑکیوں کا سا تنگ لباس پہنتا۔ بھڑکیلے رنگ، بال رنگواتا، بھنویں نچواتا۔ انگوٹھیاں، بالی پہنتا، وہ فطرتاً ایسا ہی تھا۔ ابا، تایا بھائی، بہنوئی ہر ایک سے مر جانے کی حد تک پٹا مگر باز نہ آیا۔ پھر گھر سے بھاگ کر لاہور چلا آیا۔ کسی دوست کے گھر، شادیوں پر ڈھولکی بجاتا، ناچتا، مشہور ہونے لگا۔ محلوں کے لڑکے اسے اپنی شادی میں ناچنے کے لیے بلواتے اور وہ کمائی کرنے لگا۔ باقی تینوں شامل ہوئے تو وہ ڈانسنگ گروپ بن گیا۔

سونا، کامی کو بھا گیا تھا کہ وہ ایک روپیہ بھی ضائع نہ ہونے دیتا۔ وہ بھاگ بھاگ کر چاروں کے پیروں تلے سے روپے اکٹھے کرتا بیگ بھرتا جاتا۔ چودہ سالہ سونا، کسی چوبیس سالہ مرد سا گھاگ ہو گیا۔ ہاں وہ بے ایمان نہ ہو سکا۔ نہ ہی نامرد کہ گھنگھرو باندھ کے ناچے۔

وہ پیسے جوڑتا کسی گھر خاتون، کسی دور اندیش وزیر اور کسی خواب میں جلا لالچی جیسا۔ وہ پیسہ سرمایے میں لگاتا۔ کاروبار شروع کرتا جاتا۔ ڈیری، پولٹری، فش فارمز، ماربل فیکٹری، وہ لوگوں اور بینکوں کو رسیدیں تھما تھما کے لاجواب کر دیتا۔ زندگی راتوں میں جاگنے، دنوں میں سونے لگی۔ لڑکوں کی تھکن بڑھتی رہی۔

وہ تھکن اس دن ٹوٹی۔ جس دن مدثر کی تایا زاد کسی اور سنگ رخصت ہو گئی۔

اس رات مدثر پھوٹ پھوٹ کر، دیواروں سے

سر ٹکرا ٹکرا کر روتا، تو ہر ایک کی سسکیاں نکلتیں۔
"میں نے اللہ کو چھوڑ دیا تھا ناں۔ اللہ نے سب چھڑوا دیا۔ یارو! میں جھوٹ نہیں بولتا۔ کوٹھی بس بن ہی گئی تھی۔"
وہ اتنی ہچکیاں لیتا کہ باقیوں کو لگتا، وہ ابھی کے ابھی مر جائے گا۔
اور اگلی صبح مدثر کا کمرہ خالی ملا تھا۔ ساڑھے سترہ سالہ سوما پہلی بار اچھا رزق سوچتا سویا تھا اس رات......

☆☆☆

اس رات زمین پر امید اگی تھی...... سنہری سی امید......
کئی اجاڑ راتوں کے بعد آنے والی رات......
سیاہی کے سمندر میں دور کہیں شادیانہ بجتا......
سیاہی کے سمندر میں تتلیاں، مور، چکور ناچتے......
سیاہی کے سمندر میں درختوں، پیڑ پودوں کی کھلکھلاہٹیں کودتیں، پھاندتیں
زندگی نے چلتے چلتے جیسے اس رات سے ہاتھ ملا لیا تھا۔
زندگی امید کی ہم شکل نکل آئی تھی
موسم جاتے سرما کا تھا...... کم وزن لباس پہنے جاتے مگر سانس ابھی بھی دھواں سی نکلتی۔
وقت تھا رات کا ابتدائی تیسرا پہر...... وقت تھا سوما کے جاب سے لوٹنے کا، انتہائی سادہ لباس پہنے۔ بالوں کا گول مول سا جوڑا، پانی کی بوتل، لیپ ٹاپ بیگ، شولڈر بیگ...... یوں لگتا وہ سرکس سے آئی ہے یا جا رہی ہے۔ ہاں مگر تھکن...... بڑی شور کرتی سی تھکن تھی اس کے وجود پر طاری، ہونٹ خشک ہے...... آنکھیں گہرے سایوں میں لپٹی۔
نیند کی گولیاں جیسے بے اثر ہوئی تھیں۔ ورزش سے جسم اکڑ گیا تھا مگر وہ سنبھل نہیں پا رہی تھی۔
"اتنی کافی؟ خیریت تو ہے؟" کولیگز چونکتے۔
"اتنی واک؟ پاگل تو نہیں ہو گئیں؟" حسن چیخ رہا ہوتا۔
"اتنا کام؟ زندگی سے جی اٹھ گیا کیا؟" ڈیڈی ہنستے۔
اس بار وہ قائم رہی اپنی ناراضی پر۔ پچھلے تین سال کے رشتے میں وہ تین سو بار مرتضیٰ کے آگے جھکی، رکی اور ہر خواہش سے مڑی تھی۔ مگر اب وہ خود مشکوک ہونے لگی تھی۔ اس کی محبت کے دل میں بھی وسوسے اٹھتے۔
"یار! یہ تم سے شادی کرے گا بھی کہ نہیں؟" دوستوں کا ہنسنا۔
"ڈیڈی! وہ نارمل نہیں ہے۔ آپ میرا یقین کریں۔" حسن اب صرف اعتراض نہیں کرتا تھا۔
"سوما! میں کب تک لوگوں کو وضاحتیں دوں گا کہ منگنی کیوں خاموشی سے ہوگئی۔ شادی میں کیوں تاخیر ہے۔ لڑکے کا خاندان اس سے الگ کیوں رہتا ہے؟" ڈیڈی جھنجھلائے سے رہتے۔
"اللہ اتنی وفاداری کی کیا ضرورت تھی مجھ میں؟" وہ سوالات کرتی۔ "دامن جھٹکنے اور آگے بڑھنے کی جرأت مجھ میں کیوں نہیں ڈالی گئی؟" وہ کڑھتی رہتی۔
"وہ کیوں ہے مجھے اتنا پیارا اور میں کیوں نہیں ہوں اسے اتنی عزیز؟" آنکھوں میں نمک گھل جاتا۔
ہاں مگر اس بار وہ قائم رہی اپنے مطالبے پر۔
اب رات کے اس پہر وہ گاڑی سے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھتی ہے اور آواز آتی ہے۔
"نازیہ رزاق کہتی ہے انا کا پتھر محبت کی جھیل میں گر جائے تو خوش رنگ بھنور نہیں بنتے۔ بڑے خوفناک سونامی آ جاتے ہیں۔" وہ رک گئی۔ سامنے وہ مہنگا نظر آتا قیمتی سا شخص رات کے اس پہر بھی سجا بنا کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ بولنا محال ہوا۔ وہ پانی کی بوتل، لیپ ٹاپ بیگ اپنے ہاتھوں میں لیتا بے بس سا تھا۔
"اب بس کر دو یار...... اور کتنے دن ناراض رہنا ہے؟"
"تم کہتے ہو ناں مرتضیٰ! دل کا بٹن ہونا

چاہیے۔ بٹن ہوتا ہے مگر...... کسی اور کے ہاتھ میں۔"
آواز میں برف گھلنے لگی تھی۔

"وہ کسی" جب چاہے بٹن دبا دیتا ہے...... تمہیں پتا ہے فون بند بھی ہو جاتا۔ مگر وہ ٹوں ٹوں کی گھنٹی، بس وہ گھنٹی بجتی رہتی ہے۔" حسین مرتضیٰ گونگا ہو گیا۔

"میری شادی کی اوقات...... نہیں سوما میں......" وہ لڑکھڑاتا۔

"محبت، شادی سے بڑا منصب ہے۔ کیوں بھول گئے تھے تب یہ بکواس سا لفظ۔ اوقات۔" وہ تند ہوتی۔

"کیا تمہیں کوئی شک ہے۔ مجھ پر یا......"

"مجھے محبت کے ہونے پر شک ہے بس ورنہ تم کون؟"

"سوما...... ضد چھوڑ دو۔" گڑگڑاتا۔

"خدارا! تم مجھے چھوڑ دو۔" وہ زخمی سا بلبلاتی۔

وہ آگے پیچھے پریشانی میں چلتا۔ سوما کی پانی کی بوتل ختم کرتا اور اس کے سامنے فیصلہ رکھتا۔

"رجب کی دس، فروری کی بائیس، رات کے دو بج کر سترہ منٹ سب اس بات کے گواہ رہیں گے کہ تمہیں دکھ سے بچانا میری پہلی ترجیح تھا۔ تمہیں پانے کی خواہش پر۔" وہ اس کا ہاتھ تھامتا۔

"سب گواہ ہیں کہ میرے کسی بھی خوف کو، تمہاری خوشی پر فوقیت حاصل نہیں۔ سب مجھے سچا کہیں گے کہ تمہارا ساتھ پانا ہی میرا سینچا گیا آخری خواب ہے۔ میں تم سے اسی ہفتے شادی کرنا چاہتا ہوں سوما غفران۔ اب جو تم کہو۔" وہ تادیر ساکت رہی۔

"مجھے جواب چاہیے جاناں؟" ہاں وہ کشمیری لہجے میں اسے جاناں کہا کرتا تھا۔ لیپ ٹاپ، منرل واٹر کی بوتل پکڑتے وہ پھولے منہ سے بولی تھی۔

"حسن ٹھیک کہتا ہے۔ ہمیشہ ڈومینیٹ (Dominate) کرو گے مجھے۔ ہمیشہ ڈگڈگی پر نچاؤ گے۔ پیچھے لگائے رکھو گے۔"

وہ دھیرے سے ہنس دیا تھا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتی لڑکی چل کے نہیں۔ یقین مانیے اڑ کے گئی تھی اندر...... وہ رات کتنی حسین تھی۔

جب زمین پر امید اگ آئی تھی۔ شادیانے بجتے تھے اور پروانے ناچتے تھے...... Esctacy کا وہ لاکٹ سوما غفران کی پوریں بار بار مس کرتی تھیں۔

وہ رات انجام پر پہنچ جانے کی رات تھی۔

وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے کہ جن کے انجام کی راتیں شاید سنہری ہوں۔ سو......

وہ سیاہی کو مات دیتی سیاہ رات تھی۔

سیاہی کے سمندر میں اتنا تعفن تھا کہ خود تعفن کا دم گھٹتا......

سیاہی کے سمندر میں اعمال کی برائیوں کے چھینٹے چہروں سے ٹکراتے اور ندامت کسی اور طرف دیکھنے ہی نہ دیتی......

سیاہی کے سمندر میں گناہوں کی ہر وضاحت پر جواز جھوٹا ہوا پڑا تھا۔ اور غفلت ہی سینہ پیٹتی تھی۔ موسم تھا گہرے حبس کی حکمرانی کا۔ پیچھے سے غلیظ دن وقت تھا آدھی رات کا۔ وقت مواخذے کا بھی تھا......

"یہ ہم میں طے نہیں تھا کامی۔" یہ دھاڑ سہیل کی تھی۔ "ہم مسائل سلجھانے کو ملے تھے تم سے۔ ایسی ریاکاری کا منصوبہ تم نے ہمیں نہیں بتایا تھا۔" کامی نے دبئی سے سرجری کروائی تھی۔ اس نے جسمانی ساخت میں تبدیلی کروائی تھی۔

"ہم نے مجبوراً یہ غلط کام کیا اور کچھ سال مسلسل کیا کہ مسائل ہمارے اندازوں سے زیادہ تھے۔ مگر ایسا حرام کام، ہم سے کسی پذیرائی یا پیروی کی امید مت رکھنا۔" سرفراز بھجو کا چہرے سے کامی پر لعنتیں کرتا۔

"حرام کام...... تم حرامیوں کو اسی کام نے تو مالا مال کیا ہے اور اب مرد بننے کی چاہ اٹھ رہی ہے۔ گھنگرو تم لوگ ہی باندھا کرتے تھے ناں؟" سہیل نے کامی کو پرے دھکیلا تو اٹھارہ سالہ سونا بیچ بچاؤ کروانے لگا۔

"یہ تو بڑے پھدک رہے ہیں سونے، کہیں ان کی ماؤں نے لڑکیاں تو نہیں دیکھنی شروع کر دیں ان

ہیجڑوں کے لیے؟ اب ڈھیروں کما لیے تو حج کو چلے ہیں یہ شریف مرد، ارے دو منٹ لگیں گے یہ مرد گیری اتارنے میں مجھے۔ ابھی کے ابھی تم لوگوں کے گھروں میں فون لگا دوں تو کدھر کے رہو گے تم لوگ؟ چپ کر کے اپنا کام کرو ورنہ یہ بھول جانا کہ کوئی گھر بھی ہیں تمہارے، وہ جو کوٹھیوں میں بیٹھے تم لوگوں کے ماں باپ راج راج کھیل رہے ہیں ناں۔ بس ایک اینٹ ہی نکالنی ہوگی مجھے ان کے محلوں سے۔“

سب گنگ رہ گئے۔ بے بس بھی......

”سونے تو بھاگ جا۔“ سہیل روتا۔ ”تیرا تو گھر بھی نہیں۔ نئی زندگی شروع کر۔“ اس دن سے سونے کو اس کرائے کے ڈربے جتنے مکان سے اک تعفن سی بو آنے لگی۔ وہ سونگھتا پھرتا۔ چکراتا پھرتا۔

”سہیل کو خارش ہو گئی۔ عام سی بیماری۔ وہ گھنٹوں نہاتا۔ مہنگی دوائیاں، ٹوٹکے کرتا مگر احساس گناہ نے اسے ذہنی مریض کر دیا۔

”سرفراز! میری جلد اتر رہی ہے۔“ وہ بتاتا۔

”سونے...... کیا یہاں سے میری جلد غائب ہو گئی ہے؟“ وہ کمر دکھاتا پوچھتا۔ سونے کو نوٹوں سے بو آنے لگی۔ وہ دور بھاگتا۔

”سارے سازشی ہو گئے ہیں۔ میں تم لوگوں کو جینے تو کیا مرنے بھی عزت سے نہ دوں گا۔“ کامی انتقام پر اتر آیا۔ سہیل کا مرض بڑھ گیا تو کامی نے فیصلہ صاد کیا۔

”سہیل! تم ہمارے ڈیرے سے برخاست ہو۔ گھر چلے جاؤ، مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔“ سہیل خوشی خوشی واپس لوٹ گیا۔

اس رات سونے نے چھبیسویں دفعہ ہینڈ واش کو ہاتھ پر انڈیلا اور خوب رگڑا پھر بھی بدبو نہ گئی۔ تب ہی دروازہ کھلا اور سہیل کسی طوفان کی طرح اندر گھس آیا۔

”کامی نے......“ وہ سونے کو کندھے سے تھام کے جھنجوڑتا۔

”کامی نے...... سرفراز کو اس کے خاندانی دشمنوں کے حوالے کر دیا۔“ سہیل کوئی شے ڈھونڈتا۔ ”میرے گھر سب کچھ بتا دیا اس نے۔ سب ختم ہو گیا۔“

”سونے بھاگ یہاں سے۔“ وہ بینکوں کے کاغذات، کاروبار کی رسیدیں تھیلے میں ڈال کر تھماتا تو کامی بپھر کے حملہ آور ہو جاتا۔

”یہ میری کمائی ہے۔ میری کمائی۔“ تھیلا سونے کے کندھے سے لٹکا ہوا تھا۔ وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا تھے۔

”تم نے میرے گھر والوں کو کیوں بتایا۔“ سہیل، کامی کو مارے جاتا۔ سونا خوف سے چیخ بھی نہ پایا۔

”سرفراز کو کیوں مروا دیا؟“

”کیونکہ وہ جمعرات کو امریکہ کی فلائٹ پکڑنے والا تھا اور تو اگلے مہینے دولہا بننے والا میرے ہاتھ کیا آتا؟ یہ سادھو؟“ وہ سونے کو گھسیٹتا۔

”اس کو تو تم لوگوں نے مجھے ہاتھ تک نہ لگانے دیا کہ یہ سیاہ چمڑی والا بس روپے ہی گنے گا۔ تو بتاؤ بچا کیا؟ بربادی...... وہ بھی صرف میری؟“ سہیل نے کہیں سے لوہے کا راڈ برآمد کیا تھا۔ اور کامی کے سر پر وار ہونے لگے۔ خون کے چھینٹوں نے کامی سہیل اور سونے کو لال رنگ کر دیا۔

”سونے چلا جا یہاں سے۔ اب کچھ نہیں بچا۔“

سونا پھٹی پھٹی آنکھوں سے کامی کا پچکا ہوا لاشہ دیکھتا۔ سہیل اندر الماری سے کامی کا پسٹل نکالتا ہے اور سونے کے نہیں کہنے سے بھی پہلے وہ خود کو ختم کر دیتا ہے۔

وہاں سے سونے کی دوڑ شروع ہوتی ہے۔ ڈیڑھ سال ذہنی صحت کی بحالی کے ادارے میں رہنے کے باوجود وہ چیختا اور بھاگتا ہے۔

زندگی سائبیریا میں اتری راتوں سی طویل اور تاریک تر ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

وہ رات دینے کچھ آئی تھی...... دے کچھ گئی......

وہ بھاری رات تھی......

وہ پرچھائیوں سی بے یقین رات تھی۔

وہ رات ہجر کے ہجے مکمل کر دینے والی رات تھی۔

سیاہی کے سمندر میں سورج کہیں ہمیشہ کے

لیے غرق ہو گیا۔

سیاہی کے سمندر میں کسی کے کچھ ہاتھ نہ لگا۔
سچائی بدصورت ترین لگی......

سیاہی کے سمندر میں اونگھتے کیل کانٹے، جیسے وحشی ہو گئے۔ کانٹوں کے پر نکل آئے...... وہ تلوار ہو گئے۔

موسم اترتی بہار کا تھا...... ہلکی پھلکی راتوں اور اڑتے پھرتے دنوں والا...... وقت وہی تھا...... رات کا...... ابتدائی حصہ، جہاں کھانا کھایا جاتا ہے اور چائے کا دور چلتا ہے۔

شہر کے جانے مانے نفسیاتی امراض کے پروفیسر ظہیر امجد اپنی اہلیہ بڑے بیٹے اور بھتیجے حسین مرتضٰی کے ہمراہ شادی کی تاریخ طے کرنے کو موجود تھے۔ سوما نے گہرا گلابی لباس پہنا تھا۔ وہ اتنی جچتی تھی کہ عفران سندھیلا۔ ریٹائرڈ اسلام آباد ہائیکورٹ جج کی آنکھوں میں نمی اس لباس کے گلابی پن کو کم سے کم کر دیتی۔ مرتضٰی نے ڈارک گرے شلوار سوٹ پہنا تھا۔ اور اس کی آنکھیں...... کوئی روبا کا وظیفہ کرتی تھیں وہ آنکھیں۔

وہ مسلسل ہاتھ مسلتا۔ تھوڑی کھجاتا، پاؤں جھلاتا، ظہیر امجد اسے لمبی سانس بھرنے کا اشارہ کرتے تو سوما حیران ہوتی۔

بھابھی اور پھوپھو نے سوما کو گہرا سرخ گوٹا کناری والا بھاری دوپٹہ اوڑھایا تھا۔ تاریخ دو ہفتے بعد کی تھی۔ دعا کے لیے سب کے ہاتھ اٹھے تو حسن بھائی جیسے آتش فشاں بنے سب پر لاوا بہا گئے۔

"ڈیڈی یہ اٹھے ہاتھ گرا دیں کہ کچھ الفاظ آپ کی بیٹی کا بدترین نصیب نہیں بدلنے والے۔" ڈیڈی کے ہاتھ گر گئے۔

حسن بھائی حسین مرتضٰی کا ماضی کہیں سے اٹھا لائے تھے۔ پورے کا پورا ماضی...... اس چمار کی اولاد کا...... سونے کا ماضی۔

"ظہیر امجد! میں تمہیں سو (Sue) کروں گا۔ تم نے جانتے بوجھتے میری بیٹی کی زندگی ہماری خاندانی نجابت کے ساتھ کھیلنا چاہا ہے۔"

"ان کے بھائی ملے تھے مجھے ایک کارپوریٹ سیکٹر کلب میں مجھے معلوم ہوا کہ ظہیر امجد صاحب کے بھائی ہیں تو پوچھا کہ ان کے کون سے بھائی ہیں۔ ایک بھائی کا یتیم بیٹا تو میرا بہنوئی بننے والا ہے۔ وہ بولے ظہیر امجد کے علاوہ ان کا کوئی بھائی ہے ہی نہیں ہے۔ پھر ان ہی صاحب کے ذہنی امراض کے کلینک سے میں نے معلومات حاصل کیں پھر تو معاملہ مجھے خود ہر راہ تک لے گیا۔"

حسن کی زبان چلتی اور سوما غفران پتھر ہوئے حسین امجد کو دیکھتی......

حسن چلاتا، ظہیر امجد کو دھمکاتا۔ ڈیڈی کبھی حیران کبھی غصہ ہوتے۔ آسمان ٹوٹ پڑنا قیامت کا واقع ہونا۔ دل کا پھٹنا، سوما نے یہ محض جملے ہی سنے تھے آج اس نے اس کی حقیقت کو بھی پا لیا۔ وہ بس حسین مرتضٰی کو لحظہ بہ لحظہ مرتا دیکھ رہی تھی۔

"شادی کی اوقات نہیں میری......" اس نے کہا تھا۔

"میرے پاس کچھ نہیں ہے سوائے پیسے کے، میرا قیمتی لباس، میری قیمت نہیں ہے۔" وہ اکثر اسے بتاتا۔

"اگر کبھی کچھ انہونا ہو جائے......؟ کچھ بھی...... تو......" اس کو واہمے ہوتے۔

"ڈیڈی! آپ چپ کیوں نہیں ہو جاتے۔" وہ اونچا سا بولی تھی۔

"ہم کچھ سوچ لیتے ہیں۔ کچھ بھی مگر پلیز...... گنجائش ختم نہ کریں۔" وہ چیخی ہوئی۔ بھابھی اور پھوپھو کی حقارت بھری طنزیہ نگاہیں بھی اسے شرمندہ نہ کرتیں۔

"کچھ سوچتے ہیں...... سوما غفران نیند سے جاگنا پڑے گا تمہیں اور یہ ماننا بھی پڑے گا کہ کچھ نہیں بچا۔" حسین مرتضٰی کو لگا کہ سہیل نے اسے بھاگنے کا اذن دیا ہے۔ سوما غفران کو لگا کہ وہ تو کبھی چل بھی نہ پائے گی۔

"ڈیڈی پلیز...... مجھے فرق نہیں پڑتا ناں...... پلیز کچھ نہیں ہیں یہ حقیقتیں......" الفاظ کا قحط پڑا تھا۔

"تم مجھے اتنی بھی پیاری نہیں میری بچی کہ میں تمہیں ایک لڑکا تحفہ کروں اور اس کے بدلے میں

Scanned with CamScanner

اپنے بیٹے اور اپنے نسل کو وضاحتیں، ندامتیں وراثت کردوں۔" وہ صوفے پر جھک گئی اور تواتر سے رونے لگی۔ حسین مرتضیٰ سے بولا نہ جاتا۔

"میں سچ میں بتانا چاہتا تھا سوما۔ نہ مہلت ملی نہ جرأت مجھے معاف کردینا۔ میں بس یہ سب نہیں چاہتا تھا۔" وہ قریب سے گزرا تھا۔ سوما غفران کی جان ہی تو نکل گئی۔

"مرتضیٰ! مت جانا خدارا۔ واللہ مجھے زندگی میں کبھی پچھتاوا تو کیا تمہارے ہونے کی پشیمانی تک نہ ہوگی۔"

"سوما! اسے مت روکو۔" یہ ظہیر امجد تھے۔

"میں نے اسے جن حالات سے نکالا تھا۔ وہ ڈیزرو نہیں کرتا کہ دوبارہ ان ہی حالات میں لوٹ جائے۔ اسے جینے دو، چاہے تمہارے بغیر ہی سہی۔ آج اس کا آخری ڈر بھی نکل گیا۔ آج اس نے آخری کفارہ بھی بھر دیا۔ اب شاید وہ خود کے ہونے پر مطمئن ہو ہی جائے گا۔" ڈیڈی کے اندر رنج جاگیا۔

"ظہیر صاحب کیا سوما آپ کی بیٹی ہوتی تو آپ پھر بھی مان جاتے؟" وہ اپنے درست ہونے کی تصدیق چاہتے۔

"اگر میں مرتضیٰ کو نہ جانتا ہوتا تو جانے کیا کرتا۔ مگر اسے جاننے کے بعد میرا فیصلہ ہمیشہ سوما کے دل کے حق میں ہوتا۔"

"مجھے ضد اور خاندانی غرور کسی کے اچھے اعمال سے زیادہ معتبر نہیں لگتے۔"

وہ حساب کتاب کرتے مگر سوما غفران فقط روتی اتنا روتی کہ بھابھی اسے خود میں سموئے حسن کو تاسف سے دیکھتیں۔ وہ اتنا روتی کہ غفران سندھیلا کی زندگی اس رات میں کوئی پانچ سال تو کم ہو ہی گئی ہوگی۔ پھر وہ جانے کتنا عرصہ روئی۔

پھر سمندروں سی چپ ہوگئی۔ پہاڑوں سی کھردری اور سخت...... پھر ایک رات......

تیز بارش میں وہ اسٹور میں وہ کاغذات اور ثبوت ڈھونڈتی جو حسن بھائی نے دکھائے تھے۔ پھر وہ سفر کرتی۔ چیچہ وطنی کے گاؤں کا کہ جہاں غلام محمد چمار کا گھر تھا۔ ایک کوٹھی نما گھر میں نابینا بڑھیا روتی تھی۔

"جب گھر میں دو وقت کی روٹی کے لیے لڑائیاں ہوتی تھیں، یہ عورت تب بھی روتی تھی۔ اب جب کوٹھی بن گئی۔ دکانیں بن گئیں، مرغی فارم مل گئے۔ یہ پھر بھی روتی ہے۔" مجھلی بہو کچھ زیادہ ہی اکتائی تھی۔ سوما اس مرتضیٰ کے نقوش والی بڑھیا کے پاس جا بیٹھی۔

"سب آگیا۔ سونا تو پھر بھی نہ آیا۔ میرا سونا تو پھر بھی نہ آیا......"

اس کا غم سوما کے غم کا ہم ذات تھا۔ وہ دونوں روتیں۔ بہوویں حیران ہوتیں۔

وہ ہر ہر جگہ جاتی جہاں اس نے ماضی گزارا تھا۔ ہر ہر جگہ پر کچھ لکھتی۔ کبھی روتی، پھر دعائیں مانگتی۔

"اللہ میری یادداشت مٹ جائے۔"

زندگی راتوں سی خاموش ہوگئی۔ قبرستان کی راتوں سی......

☆☆☆

پوری دنیا میں سماجی مدارج کے دو گروہ ہیں۔ ذات پات کا نظام اور سماجی رتبے یا کلاس کا نظام۔ ذات پات کا نظام کٹر نظام ہے۔ کوئی اپنی ذات تبدیل کرنے میں بے بس ہے کہ سماج یا معاشرہ اسے ایسا کرنے نہیں دے گا۔ دوسری طرف سماجی کلاس (Social Class) ہے جو لچک دار نظام ہے۔ ہر ملک ہر معاشرے میں ہزاروں ایسی مثالیں مل جائیں گی کہ جو یہ واضح کردیں کہ کیسے لوگوں نے محنت کی اور اپنے سماجی رتبوں میں اضافہ کرلیا۔ اس وقت کے دنیا کے امیر ترین افراد انتہائی مڈل کلاس خاندانوں سے ہیں۔

مگر پاکستان شاید وہ واحد ملک ہے کہ جس میں یہ دونوں نظام ہی کٹر ہیں۔ کمی کمین، مزارع، ریڑھی بان، مزدور کا بیٹا افسر بن کے بھی ذومعنی جملوں کو سہنے پر ہمیشہ مجبور رہتا ہے۔ ذات پات کے علاوہ سماجی کلاس دوسری بڑی بلا بن گئی ہے جو جانے کتنے دل نوچ لیتی ہے۔ کتنی خودکشیاں اس بات کے ذمے بھی

Scanned with CamScanner

ہیں کہ کمہار کے بیٹے کو جرمنی میں پڑھنے کا اسکالرشپ کیسے مل گیا؟ ارے بھئی اور ان بے چاروں کے پاس کیا ہوتا ہے۔ سوچتے ہیں پڑھ لیں گے تو جانے کیا ہو جائیں۔ وہ فلاں نائی کی بیٹی کا میڈیکل میں داخلہ کیسے ہو گیا۔ بدقسمتی سے دلچسپ بات کہ گھروں میں بچوں کی تربیت ہی یوں کی جاتی ہے۔

"نالائقوں اس درزی کے لڑکے نے تحصیل بھر میں ٹاپ کیا ہے۔ تم لوگ نہ دو لفظ پڑھ کے ہمارا نام روشن کرنا۔ کیوں؟ درزی کا بیٹا ٹاپ کرے تو اچنبھا کیوں؟"

سماجی وسیاسی فلاسفر جان لاک اپنے مضمون میں ایک لاطینی اصطلاح Tabula Rasa (صاف سلیٹ) استعمال کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ صاف سلیٹ ہوتا ہے باقی معاشرہ اس سلیٹ پر جو لکھتا ہے وہ ویسا ہی بنتا ہے۔

غلام محمد کا بیٹا پیدا ہوا تو اس کے ہاتھ میں بیلچہ نہ تھا۔ یہ اسے لوگوں نے، معاشرے نے بتایا کہ وہ چمار ہے۔ بھوک، خواب، نظام تعلیم، اور مواقعوں کی کمی نے اسے چمار ہی رہنے دیا۔ یہ درست ہے کہ اس کا ذریعہ معاش ایک رذیل کام تھا۔ مگر یہ بھی سوچا جائے کہ ایک پنڈال میں ناچنے والے چار ہوتے تو دیکھنے والے ہزاروں، رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہوئے۔ سود دینے، لینے دونوں کی ممانعت تو پھر رقص دیکھنے والے، ناچنے والوں سے معتبر کیسے ہو گئے؟

جان راؤلز کہتا ہے کہ سماجی انصاف صرف اتنا ہے کہ یہ ایک نیچرل لاٹری ہے۔ لاٹری لگ گئی تو اونچے خاندان، پیسے کی ریل پیل میں پیدا ہو جاؤ گے۔ ورنہ پھر وہی لاٹری کا ٹکٹ پکڑے مایوس کھڑے رہ جاؤ گے۔ کیونکہ لاٹری تو کسی ایک کی ہی نکلتی ہے ناں؟

لاٹری والوں کی نسل در نسل لاٹری نکل ہی رہی ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ ہم جیسوں کو اپنی بے کار ٹکٹ کا کیا کرنا ہے۔"

اس نے تھک کے قلم رکھ دیا۔

☆☆☆

وہ رات بس عام سی تھی۔

سیاہی کے سمندر میں کوئی جنبش تک نہ تھی۔

موسم کی ہوا چلتی تھی...... شاید آندھی تھی۔

وقت تھا اس کے جاگنے کا...... سامنے والا تاریک بنگلہ دیکھنے کا......

"سوہا! لوٹ آؤ بیٹا۔" ریٹائرڈ جج زمین پر بیٹی کے ساتھ بیٹھے، ریلنگ کی جالی کے پار وہ بنگلہ دیکھتے۔

"میں ٹھیک ہوں ڈیڈی۔"

"وہ نہیں آئے گا۔" آواز ست ہو ہو جاتی۔ وہ باپ جو تھے۔

"انتظار کو کسی چیز سے مطلب نہیں۔" وہ جم کے کہتی۔ ڈیڈی تاریکیاں ٹٹولتے۔ لفظ ادھار چاہتے۔

"مجھے معاف کر دو۔" اتنا ہی بول پائے۔ وہ بالوں میں انگلیاں چلاتی، گردن سہلاتی...... ہاں وہ چین کو خود میں کہیں نہ پاتی۔

"شاید مجھے کچھ وقت لینا چاہیے تھا۔" ڈیڈی اندازے سے لگاتے۔

"اس رات کے ساتھ سب ختم ہو گیا۔ آپ کی چوک بھی۔ مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں، بس کوئی یہ سمجھ جاتا کہ وہ ایک ہی تھا...... دوبارہ بھی نہیں ملے گا۔ ڈیڈی! مجھے دل کا بٹن نہیں مل رہا۔ اس کو بند کرنا ہے مجھے۔ بٹن والا یہ ٹوں ٹوں بجاتی گھنٹی چھوڑ گیا ہے بس......"

وہ بالکونی پر چلتی تاریک بنگلے سے اک شاعرہ کی آواز سنتی، جو کسی مرتضیٰ جیسے کا غم دہراتی...... گنگناتی۔

پابند سلاسل ہوں کہ مٹی میں گڑی ہوں
میں اپنی ہی دیوار کے سائے میں کھڑی ہوں
آسان میسر بھی کچھ بھی نہیں آیا
میں سانس بھی لینے کو ہواؤں سے لڑی ہوں

☆

Scanned with CamScanner